عرضِ حال، شکوہ اور جوابِ شکوہ کا تقابلی مطالعہ

عبدالشکور شاکر
اسسٹنٹ پروفیسر اردو
گورنمنٹ کالج سیٹلائٹ ٹاؤن، گوجرانوالا

A COMPARATIVE STUDY OF ARZ-E-HAL SHIKWA AND JAWAB-E-SHIKWA

Abdul Shakoor Shakir
Assistant Professor of Urdu
Govt. College Satellite Town, Gujranwala

Abstract

Hali's Arz-e-Hal and Iqbal's Shikwa and Jawab-e-Shikwa are three poems in which the national decline of the Muslims has been highlighted by comparing their past and present. Their central idea is based upon national revival of the Indian Muslims. Since the desire of national revival is common to Hali and Iqbal, there are many similarities between their poems. Arz-e-Hal is written in the form of Qaseeda, while Shikwa and Jawab-e-Shikwa are composed in Musaddas, but thematically they are similar. Despite being different in form and style, Shikwa and Jawab-e-Shikwa are the extensions of Arz-e-Hal. The article analyzes the similarities and differences of these poems.

Keywords:
علامہ اقبال، الطاف حسین حالی، عرضِ حال، شکوہ، جوابِ شکوہ، موازنہ، مماثلت، امتیاز، نشاۃِ ثانیہ

الطاف حسین حالی (۱۸۳۷ء۔۱۹۱۴ء) کی 'عرضِ حال بہ جنابِ سرورِ کائنات' اور علامہ اقبال(۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء) کی 'شکوہ'اور 'جوابِ شکوہ'اپنے اپنے دور کی تین معروف نظمیں ہیں، جن کا موضوع اصلاحِ احوال اور ملی نشاۃِ ثانیہ کی آرزو سے عبارت ہے۔ متذکرہ نظموں نے مسلمانانِ ہند میں قومی شعور اور احساسِ زیاں بیدار کرنے میں ایک مؤثر کردار ادا کیا ہے۔ ان نظموں کا تقابلی مطالعہ کرنے سے پہلے ان کا تعارفی اور تنقیدی جائزہ لینا ضروری ہے۔

عرضِ حال بہ جنابِ سرورِ کائنات کا تعارفی و تنقیدی جائزہ

خواجہ الطاف حسین حالیؔ ہندوستان کے عظیم مصلح اور صاحبِ طرز ادیب ہیں، جنھوں نے ادب کو جدت اور ادب برائے زندگی کے تصور سے روشناس کیا۔ حالی اردو کے اولین نقاد اور تحریکاتی شاعر بھی ہیں۔ حالی ہی نے مسلمانوں میں قومی شعور پیدا کرنے کی غرض سے اردو میں قومی شاعری کی بنیاد رکھی۔ علاوہ ازیں نظم و نثر کے ذریعے اصلاحِ معاشرہ کا فریضہ سرانجام دیا اور برصغیر کے تساہل پسند مسلمانوں کو خوابِ گراں سے جگا کر آمادۂ عمل کیا۔ حالیؔ نے ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء میں قومی موضوع پر ''مدوجزرِ اسلام'' کے نام سے ایک طویل نظم لکھی تاکہ مسلمانوں کو آئینہ دکھا کر ان کے حال کی تہذیب کی جا سکے۔ نظم کے حزنیہ انجام کے سبب جب تمام اُمیدیں منقطع اور کوششیں رائگاں نظر آنے لگیں تو اس خرابی کے تدارک کے لیے ایک نئی تحریک کے تحت ۱۳۰۳ھ مطابق ۱۸۸۶ء میں اسی نظم کا مقتضائے حال کے موافق ایک رجائی ضمیمہ بھی تحریر کیا گیا(۱)، جس کی وجہ سے اس کی قدر و قیمت دوچند ہو گئی۔ یہ انقلابی نظم خاص و عام میں بہت زیادہ مقبول ہوئی۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کا انتخاب شاملِ نصاب کیا گیا اور مساجد و محافل میں اہتمام سے پڑھا گیا۔ اس نظم کے ردِ عمل اور تتبع میں متعدد نظمیں لکھی گئیں۔(۲) مسدس کی عام اشاعت اور مقبولیت کے بعد حالیؔ نے قومی شاعری کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے ''شکوۂ ہند'' اور ''عرضِ حال'' ایسی مؤثر نظمیں لکھیں۔ ان نظموں کی تصنیف سے حالی کا مقصد مسلمانوں کے ماضی اور حال کا تقابلی جائزہ لے کر انھیں ان کی پس ماندگی کا احساس دلانا، جمود کو توڑنا اور قومی ترقی کے لیے متمدن اقوام سے مسابقت کا جذبہ پیدا کرنا ہے۔ معروف تاریخ نویس رام بابو سکسینہ (۱۸۹۲۔۱۹۵۷ء) نے ان نظموں کے متعلق اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

''شکوۂ ہند اور قصیدۂ غیاثیہ بھی مسدسِ مدوجزرِ اسلام کے طرز میں ہیں۔ ان میں بھی وہی بیان اسلام کی قدیمی شان و شوکت اور موجودہ پستی و نکبت کا ہے، جو اَب ہندوستان میں رُونما ہے۔ ترکِ لذات کی جگہ مزیداری؛ سادگی کی جگہ آرام طلبی؛ قوت اور مردانگی کے عوض ضعف اور بوداپن؛ چالاکی و مستعدی کے بدلے سستی و کاہلی، اب گھر گھر نظر آتی ہے۔ اس مرقع میں کہیں کہیں تصاویر کا رنگ شوخ اور تیز ہو گیا ہے مگر اس غرض سے کہ خوابیدہ جماعت چونکے اور خوابِ غفلت سے بیدار ہو۔'' (۳)

عرضِ حال کا دوسرا نام قصیدۂ غیاثیہ ہے۔ عربی میں غیاث فریاد کو کہتے ہیں۔ چوں کہ حالیؔ نے نظم میں نبی ﷺ سے فریاد کی ہے، چناں چہ انھوں نے اپنی نظم کا یہ نام رکھا اور قصیدہ کا لفظ اس لیے مضاف کیا کہ یہ فریاد قصیدے کی ہیئت میں مرتب ہے۔ حالی نے عرض حال کی شکل میں صنفِ قصیدہ کو معنوی تنوع بخشا ہے۔ امرا یا اہل اقتدار کی مدح سرائی کی بہ جائے حضور ﷺ سے قومی گزارشِ احوال کو اپنے قصیدے کا موضوع بنایا ہے۔ حالی نے مذکورہ نظم ۱۸۸۸ء میں لکھی تھی، جسے بیش تر ناشرین نے **مسدس** کے آخر میں شائع کیا۔ یہ اقدام اصولاً صحیح نہیں کیوں کہ عرضِ حال کی اپنی آزاد اور مستقل حیثیت ہے مگر ایسا اس لیے کیا گیا کہ عرضِ حال مسدسِ حالی کا ارتقائی تسلسل ہے۔ زیر مطالعہ نظم میں حالیؔ نے نبی کریم ﷺ کے ایک اُمتی ہونے کی حیثیت سے ان کے حضور میں دردمندانہ التماس کیا ہے کہ اہل اسلام کی حالیہ کیفیت بہت تشویش ناک ہے۔ جو مسلم اُمہ کبھی درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی تھی، وہی آج انتہائی پستی میں جا گری ہے:

اے خاصۂ خاصانِ رُسل، وقتِ دُعا ہے
اُمت پہ تری آکے عجب وقت پڑا ہے

حالیؔ حضور ﷺ سے عرض گزار ہیں کہ آپ کی اُمت نے بہت سی بہاریں دیکھ لیں، اب خزاں کا موسم آ چکا ہے، عروج کے دن جا چکے، صورتِ حال پہلی سی نہیں رہی، تہذیبی قدریں دم توڑ چکی ہیں، سو اب ملی حمیت زندہ ہے نہ پہلی سی شان و شوکت ہی باقی ہے۔ مسلمانوں میں پس ماندہ قوموں کی سی خرابیاں در آئی ہیں۔ جاں فشانی کی جگہ تن آسانی اور فعالیت کی جگہ انفعالیت نے لے لی ہے، فرائض سے پہلو تہی کا رجحان عام ہو چکا ہے۔ نئی نسل کو اپنی صلاحیتوں کو بروے کار لانے کی بہ جائے دوسروں پر بے جا انحصار کی خو سی ہو گئی ہے۔ یہاں جاہل وحشی جب کہ عالم بے عقل اور بے عمل ہے۔

غریب قوتِ بازو پر بھروسا کرنے کی بہ جائے بھیک مانگتا ہے جب کہ امیر مغرور اور غریب کے حال سے لاعلم ہے۔ چھوٹے بے ادب اور بڑے بے مہر ہیں۔ جو مسلمان کبھی اخلاقِ حسنہ سے متصف تھے، آج ان کی اولاد اخلاق سے عاری ہو چکی ہے۔ جو لوگ کسی زمانے میں قبولِ اسلام کی وجہ سے باوقار، معزز اور اقبال مند ہوئے تھے، آج انھی کی آل اپنے انفعالی کردار سے ملت کے لیے باعثِ عار بن چکی ہے۔ الغرض ہر سماجی طبقے کے حالات ناگفتہ بہ اور اصلاح طلب ہیں، جب کہ نوبت یہاں تک آپہنچی ہے کہ معاشرے میں کوئی اصلاح کرنے اور صورت حال میں بہتری لانے والا موجود نہیں۔

حالیؔ کا شمار برِّصغیر کے ان درد مند زعما اور مصلحین میں ہوتا ہے جو قومی بد حالی پر ہر وقت متفکر رہتے اور ذاتیات سے بالاتر ہو کر قومی اصلاح و فلاح کی تدابیر سوچتے رہتے تھے۔ ان کی یہی سوچیں قومی شاعری کی صورت میں ظاہر ہوئی ہیں۔ ''عرضِ حال'' کا موضوع قومی زوال ہے اور زوال کے متعلق حالی کا خاص نقطۂ نظر ہے، جس کی تاریخِ اسلام سے توثیق ہوتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ معاصر مسلمانوں نے کتاب و سنت سے اپنا رشتہ توڑ لیا، نیز امورِ حیات میں عصری تقاضوں کا قطعی لحاظ نہیں کیا بل کہ اپنے قول و فعل سے دین و دنیا میں ایک خلیج حائل کر دی، جس کے نتیجے میں زوال ان کا مقدر بن گیا اور وہ متمدن اقوام کے مقابلے میں بے توقیر ہو کر رہ گئے۔ حالی کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کو برے دن اپنی خامیوں اور قباحتوں کے سبب دیکھنا پڑے اور اغیار سے ہزیمت اُٹھانا پڑی ہے مگر اب ہزیمت کو کام یابی، ذلت کو عزت اور خفت کو افتخار سے بدلنا ناگزیر ہو چکا ہے۔ اسی سیاق و تناظر میں حالی کا یہ تقاضا ہے کہ مسلمان پہلے اپنا محاسبہ کریں اور پھر ان اخلاقی و معاشرتی خامیوں اور قباحتوں کو دُور کر دیں جو رفتہ رفتہ اُن کی ہزیمت اور رسوائی کا سبب بن گئیں۔ اس کے بعد قرآن و سنت اور عصری علوم کی روشنی میں اپنے متنوع مسائل کا حل تلاش کریں تاکہ پھر سے ایک متمدن قوم کی طرح دنیا میں کام یاب و باوقار اور آبرومندانہ زندگی گزار سکیں۔

حالی کے مطابق برصغیر میں عرب کی طرح سے اسلام کی اشاعت اور علوم و حکم کی ترویج نہیں ہو سکی۔ اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ علما و حکما کی بہ جائے جہلا دین کے وارث بن گئے جو دین اسلام کو پوری طرح سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے چناں چہ ذہنی تقلید، کم علمی اور عدم بصیرت کے سبب نہ صرف

علمی مسائل کا معقول حل نہ نکال سکے، بل کہ مغربی یلغار کے خلاف اسلام کا مؤثر انداز سے دفاع نہ کر سکنے کے باعث اس کی کماحقہ اشاعت سے بھی قاصر رہ گئے۔ علما کے علاوہ جمہور بھی بعض مسائل کا موجب بنے ہیں۔ جمہور نے ہندوؤں کی پیروی میں بہت سی سماجی رسوم کو دین میں شامل کر کے اسلام کی حقیقی تصویر کو بری طرح مسخ کر دیا جب کہ علما اس کی بحالی میں ناکام رہے۔ اسی سیاق وسباق میں حالیؔ حضور ﷺ سے ملتمس ہیں کہ کل جو آفتاب عرب کے اُفق سے نہایت آب وتاب سے طلوع ہوا تھا، آج عجم میں اس کی روشنی ماند پڑ گئی ہے؛ جو دین کبھی جزیرۂ عرب سے بہت ہی شان سے نمودار ہوا تھا، آج ہندوستان میں اس کا حال ایک مسافر یا مہمان کا سا معلوم ہوتا ہے:

جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے
جس دین کے مدعو تھے کبھی سیزر و کسریٰ
خود آج وہ مہمانِ سرائے فقرا ہے
جو دین کہ گودوں میں پلا تھا حکما کی
وہ عرضۂ تیغِ جہلا وَ سُفہا ہے
جس قصر کا تھا سر بہ فلک گنبد اقبال
ادبار کی اب گونج رہی اس میں صدا ہے

حالیؔ نے مندرجہ اشعار میں اسلام کے ماضی وحال کا موازنہ کیا ہے۔ ہر شعر کے پہلے پہلے مصرع میں تاریخِ اسلام کے اس سنہری دور کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب اسلاف کی مساعیِ جمیلہ کی بہ دولت حلقۂ اسلام وسیع ہو رہا تھا، اسلام کی حقانیت ذہنوں پر روشن ہو رہی تھی، اسلامی علوم وفنون کے ذخیرے میں روز بہ روز اضافہ ہو رہا تھا، ساری دنیا میں اسلامی تہذیب وثقافت فروغ پذیر تھی اور اسلام کو عقلی و فطری دین ہونے کی اساس پر جملہ مذاہبِ عالم پر کلی فوقیت حاصل تھی۔ اُس تاریخی تناظر میں مسلمان کہلانا مسلمانوں کے لیے باعثِ افتخار و وقار تھا۔ بہ خلاف ازیں ہر شعر کے مصرعِ ثانی میں حال کی تصویر پیش کی ہے، جس میں حالی نے ظاہر کیا ہے کہ آج مسلمان بھی آلام ومسائل سے دوچار ہیں اور اسلام کو بھی متعدد چیلنجز درپیش ہیں اور دونوں بے وقار بھی ہو چکے ہیں۔ اقبال کا ادبار میں بدلنے کا حال خود مسلمانوں کی کم علمی، کوتاہ نظری، دینی بیزاری اور انفعالیت کا نتیجہ ہے۔

حالیؔ ''عرضِ حال''میں مسلمانوں کی خرابی اور زبوں حالی کے بیان میں اعتقادی مسائل کو بھی زیر بحث لائے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں نے معاشرے میں عقیدۂ توحید کا فہم نہ ہونے اور شرک کے پھیلنے کا ذکر کیا ہے۔ انھیں دکھ ہے کہ جو مسلمان دینِ ابراہیم کا پیروکار تھا، آج آزر کا پیروکار ہے کیوں کہ وہ شرک کے مضمرات سے چنداں آگاہ نہیں۔ بعدازاں حالیؔ نے مسلمانوں میں فرقہ پرستی، نفاق اور منافرت کے راہ پانے کا ذکر بھی بہت ملال سے کیا ہے:

جس دین نے غیروں کے تھے دل آ کے ملائے
اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جُدا ہے
جو دین کہ ہمدردِ بنی نوعِ بشر تھا
اب جنگ و جدل چار طرف اس میں بپا ہے

یہ تاریخی حقیقت ہے کہ حالیؔ کے دور میں متحدہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ اختلافات کو ہوا دی گئی۔ بیش تر مذہبی جماعتیں اسی دور کی پیداوار ہیں، جن کی گروہ بندی نے اتحاد کو پارہ پارہ کر کے مسلمانوں کو کم زور کر دیا ہے۔ اس کے برعکس قرونِ اولیٰ میں تمام مسلمان متحد تھے اور اتحاد ان کی قوت تھا۔ نبی اکرم ﷺ کی تعلیمات سے عربوں کے جملہ اختلافات ختم ہو گئے اور مؤاخاتِ مدینہ کی شکل میں مہاجرین وانصار کے مابین اخوت کا رشتہ قائم ہو گیا تھا، جسے نبھانا ان کی قابلِ ترجیح تہذیبی قدر بن گیا تھا۔ ایسی تہذیبی قدروں کی بنیاد پر دنیا کی پہلی فلاحی ریاست کا قیام عمل میں آ گیا تھا مگر حالیہ صورتِ حال اس سے مختلف ہے۔ ماضی کے مسلمان جن اقدار کے پاس دار تھے، حال کے مسلمان ان سے بے بہرہ ہیں۔ اسی تناظر میں حالیؔ کا کہنا ہے کہ مسلمانوں کا انحطاط انھی اقدار سے بے بہرگی اور نفاق کا نتیجہ ہے؛ لہٰذا جب تک وہ باہمی اختلافات بھول کر متحد نہیں ہو جاتے اور اپنے معاملات میں تہذیبی قدروں کا احیا نہیں کر لیتے، تب تک اسلامی تشخص کی بحالی اور قومی وقار کی بازیابی ممکن نہیں۔

حالی اپنے وسیع مطالعہ ومشاہدہ کی بہ دولت جدید افکار وتصورات، نظریات، عصری مسائل اور ان کے تقاضوں سے آگاہ ہیں اور عوام کو بھی اسی آگہی سے بہرہ مند دیکھنا چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک سیاست ہو یا معاشرت؛ ادب ہو یا تعلیم؛ غرض کہ ہر شعبۂ حیات کو جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کی ضرورت ہے۔ مسلمانانِ ہند میں جدید مسائل کے شعور اور ان کے حل کی صلاحیت پیدا کرنے کے لیے

علی گڑھ تحریک کی خدمات میں حالی نے بھی اپنی علمی حیثیت و بصیرت کے مطابق حصہ ڈالا ہے۔ حالی مقاصدِ تحریک کے حصول میں سرسید(۱۸۱۷ء۔۱۸۹۸ء) اور ان کے رفقا کے شریکِ کار رہے ہیں۔ ادبیاتِ اردو میں حالی کا کام اپنی نوعیت اور اثرات کے لحاظ سے نہایت وقیع ہے۔ مضامین کے علاوہ مسدسِ مدوجزر اسلام، شکوۂ ہند، مناجاتِ بیوہ، چپ کی داد، ننگِ خدمت، مرثیۂ حکیم محمود خاں اور عرضِ حال اس ضمن میں قابلِ ذکر نظمیں ہیں۔ یہاں عرضِ حال سے چند منتخب اشعار مندرج ہیں، جن میں حالی نے عصری امور و مسائل اور ان کے تقاضوں سے اپنی قوم کی لاعلمی پر تنقید کی اور حالات کے مطابق تازہ آگہی کی ضرورت پر زور دیا ہے:

کی زیبِ بدن سب ہی نے پوشاک کتاں کی
اور برف میں ڈوبی ہوئی کشور کی ہوا ہے
دریائے پرآشوب ہے اک راہ میں حائل
اور بیٹھ کے گھڑ ناؤ پہ یاں قصد ثنا ہے
یاں نکلے ہی سودے کو درم لے کے پرانے
اور سکہ رواں شہر میں مدت سے نیا ہے
درکار ہیں یاں معرکے میں جوشن و خفتاں
اور دوش پہ یاروں کے وہی کہنہ ردا ہے

عصری امور و مسائل کے متعلق حالیؔ کی حضور ﷺ سے استدعا انفرادی نہیں؛ اجتماعی ہے مگر اس اجتماعی استدعا کو حالی نے قلبی واردات کی شکل میں پیش کیا ہے اور اس عقیدے سے پیش کیا ہے کہ ہر مشکل مسئلے کا حل اور ہر دکھ کا دارو صرف حضور کی بارگاہِ نیاز سے حاصل ہو سکتا ہے۔ وہی ہر درد کا مداوا کر سکتے ہیں۔ حالی کے نزدیک آنحضور ﷺ کے سوا کوئی ایسا ناخدا نہیں، جو ڈوبتی ہوئی کشتی کو پرآشوب دریا کی تلاطم خیز لہروں سے بچائے اور کنارے لگائے:

فریاد ہے اے کشتیِ اُمت کے نگہباں
بیڑا یہ تباہی کے قریب آن لگا ہے

حالیؔ نے مذکورہ شعر میں مراعاۃ النظیر کی شکل میں تین عام فہم استعاروں کا استعمال کیا ہے۔ پہلا استعارہ 'کشتیِ اُمت' کا ہے جو ملت اسلامیہ کے لیے استعمال ہوا ہے، دوسرا استعارہ 'نگہبان' کا ہے،

جو بہ حیثیت رسول حضورؐ کے لیے آیا ہے اور تیسرا استعارہ 'بیڑا' بھی مسلم اُمہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ استعاروں کے استعمال کی غرض اپنے مدعا کو بلیغ اور شائستہ بنانا ہے مگر جہاں بات بہ راہِ راست کہی گئی ہے، وہاں فریاد میں حالیؔ کا انداز گلہ آمیز اور لہجہ کسی قدر تلخ بھی ہو گیا ہے، جس پر انھوں نے خود کو متنبہ کیا اور وہیں اپنی فریاد کو تقاضاے ادب کے تحت تمام کر دیا ہے:

اے حالیِ گستاخ ! نہ بڑھ حدِّ ادب سے
باتوں سے ٹپکتا تری اب صاف گلا ہے
ہے یہ بھی خبر تجھ کو کہ ہے کون مخاطب؟
یاں جنبشِ لب خارج از آہنگِ خطا ہے

مولانا حالیؔ کی مذکورہ نظم کا مطالعہ ان کے پر آشوب عہد کی تاریخ کے تناظر میں کریں تو اس کا ایک ایک شعر مسلمانانِ عالم کے عدمِ بصیرت کا غماز اور تہذیبی و تمدنی بے بضاعتی کا عکاس نظر آتا ہے، جس میں اہلِ دانش اور حقیقت پسندوں کے لیے چشم کشا حقائق پر مشتمل عبرت مضمر ہے۔

عرضِ حال قصیدے کی ہیئت میں لکھی ہوئی نظم ہے۔ اس ہیئت میں پہلے شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوتے ہیں، جسے اصطلاح میں مطلع کہا جاتا ہے۔ اس کے بعد آنے والے ہر شعر کا پہلا مصرع آزاد جب کہ ہر دوسرا مصرع پہلے شعر کا ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتا ہے۔ متذکرہ نظم میں ادا، وفا، جفا، غنا، ثنا، نوا، دوا، قافیے ہیں جب کہ 'ہے' ردیف ہے جو حالیہ کیفیت کی ترجمان ہے۔ حالیؔ نے چند مشکل قافیے بھی برتے ہیں، مثلاً: غُربا، شُرَفا، فُقَرا، عُلَما، سُفَہا۔ نظم بحر ہزج مثمن مکفوف محذوف میں مرتب ہے، جس کے مقررہ ارکان حسبِ ذیل ہیں:

مفعول مفاعیل مفاعیل فعولن (دوبار)

یہ بحر ہزج کا ایک ثقیل مزاحف وزن ہے، جس میں شعر کہنا ایک مشکل تخلیقی عمل ہے اور قصیدے کی ہیئت میں ایک طویل نظم لکھنا تو اور بھی مشکل ہے۔ متذکرہ وزن میں عموماً متین اور المیہ مضامین ادا کیے جاتے ہیں۔ اسی مناسبت سے حالی نے اپنی نظم کے لیے اس ثقیل وزن کا انتخاب کیا ہے۔ متذکرہ نظم کل تریسٹھ اشعار پر مشتمل ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ 'عرضِ حال' ایک دل گداز قومی مرثیہ ہے، جس میں حالیؔ نے نوآبادیاتی عہد کے مسلمانوں کے تہذیبی و تمدنی حالات کی تصویر کشی کی ہے۔ اس دور کے مسلمانوں کو اس نظم کے

آئنے میں دیکھا جائے تو یہ نظم ان کے مسخ شدہ خط و خال اور زوال یافتہ ہند اسلامی تہذیب کی آئنہ دار معلوم ہوتی ہے۔ ادبیاتِ اُردو میں اپنے موضوع، آہنگ اور اسلوب کی جہات سے عرضِ حال ایک اہم نظم ہے، جس کے نعتیہ اور قومی شاعری پر گہرے اثرات مرتب ہوئے ہیں۔ آج بھی محراب و منبر اور محافل سے اس کی درد بھری آواز سنائی دیتی ہے۔

نظم شکوہ کا تعارفی و تنقیدی جائزہ

'شکوہ' علامہ اقبال کی ایک معروف نظم ہے جو اُن کے مجموعہ کلام بانگِ درا کے حصۂ سوم میں شامل ہے۔ یہ طویل اور مقبولِ عام نظم اقبال نے قیامِ یورپ سے واپسی کے بعد مسلمانوں کے تہذیبی وسیاسی زوال اور اس سے پیدا شدہ متنوع مسائل کے پیش نظر ۱۹۱۱ء میں تصنیف کی اور ریواز ہاسٹل میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے اپریل ۱۹۱۱ء کے منعقدہ سالانہ اجلاس میں تحت اللفظ پڑھی۔ بانگ درا میں شائع ہونے سے پہلے یہ نظم پنجاب ریویو (مئی ۱۹۱۱ء) میں چھپی اور اس کے بعد مخزن بابت جون ۱۹۱۱ء کی اشاعت میں شائع ہوئی۔(۴) اہلِ ذوق نے اسے بہت پسند کیا جب کہ مذہبی طبقے نے بعض مضامین کے لحاظ سے قابلِ گرفت بنایا۔ اقبال نے اس نظم میں مسلمانوں کے عروج کا فخریہ تذکرہ کیا اور اسی کے ساتھ ان کے زوال کا المیہ بھی بیان کیا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کے من حیث القوم دو ادوار کا تقابل پیش کیا ہے: ایک ماضی اور دوسرا حال؛ ماضی شان و شوکت کا امین جب کہ حال انحطاط کا آئنہ دار ہے اور اس پر متمدن اقوام سے موازنہ مستزاد ہے۔ دونوں موازنوں میں حیثیتی امتیاز سے پیدا ہونے والا المیہ شکوہ کا بنیادی موضوع ہے۔ اسی موضوع کے تحت اقبال نے مسلمانوں کو درپیش آلام و مسائل سے متعلق ایک جذباتی شکایت کی صورت میں جو مطالب بیان کیے، ان کا خلاصہ حسبِ ذیل ہے:

اے اللہ! ہم نے تیرے دین کی اشاعت کے لیے بڑا کام کیا، رزم گاہوں میں جہاد کرتے ہوئے شجاعت کے بڑے جوہر دکھائے، اعلاءِ کلمۃ اللہ کو اپنا نصب العین بنایا، قیامِ مساوات سے آقا و غلام کا امتیاز ختم کیا، جملہ امور میں تیری اور تیرے نبی کی اطاعت کی، جس کے نتیجے میں ہم دنیا میں عزت سے سرفراز ہوئے تھے مگر کیا وجہ ہے کہ آج ہم محکوم و مجبور اور بدحال ہیں، جب کہ اغیار تیری عنایت سے کامران و خوش حال ہیں؟ آخر مسلمان تیری پہلی سی محبت و عنایت کے حق دار کیوں نہیں رہے؟

عموماً نظم کسی ایک موضوع پر مبنی ہوتی ہے اور شاعر کا ارتکاز اسی موضوع پر ہوتا ہے، تاہم اس کے متعدد جہات اور مباحث بھی ہو سکتے ہیں۔ شکوہ کے بھی متعدد مباحث ہیں۔ ان کا اجمال یہ ہے کہ پہلے دو بند نظم کی تمہید ہیں، جن میں شاعر نے اپنی شکوہ سنجی کا جواز پیش کیا ہے اور پھر تیسرے سے تیرھویں بند میں تروتیجِ اسلام کے لیے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کے قابل قدر کارناموں کا ذکر کیا ہے جب کہ چودھویں سے انیسویں بند میں معاصر مسلمانوں کے زوال کا مؤثر انداز سے نقشہ کھینچا ہے۔ اس کے بعد بیسویں سے تئیسویں بند میں خدا سے زوال کا سبب پوچھتے ہوئے گلہ کیا ہے کہ مسلمانوں میں ہنوز ایمانی حرارت موجود ہے، وہ آج بھی تیرے اور تیرے نبی کے وفادار اور اطاعت گزار ہیں، پھر وہ اتنے بدحال اور مسائل میں مبتلا کیوں ہیں۔ یہاں شاعر نے مسلم اور غیر مسلم اقوام کی تمدنی حیثیت کا موازنہ بھی کیا ہے۔ یہی موازنہ موضوع کا المیہ بنتا ہے، جس نے ایک طرف نظم میں معنویت پیدا کی تو دوسری طرف اسے تاثیر بخشی ہے۔ چوبیسواں اور پچیسواں بند بھی انھی مباحث کی توسیع ہیں، جن میں شاعر نے حالی کی طرح حزنیہ انداز میں مسلم امہ کا حالِ زار بیان کیا ہے جب کہ اگلے بند میں ضمیمہ مسدس کے رنگ میں یقین بھی ظاہر کیا ہے کہ مسلمانوں کے قلوب نورِ حق سے روشن ہیں، ان کا ایمانی جذبہ ہنوز زندہ ہے، جس کے اظہار کے لیے وہ بے چین ہیں۔ ستائیسویں سے اکتیسویں بند کے اشعار دعائیہ ہیں، جن میں شاعر نے اپنے معاصر مسلمانوں کو درپیش مسائل کے حل کے لیے اللہ تعالیٰ سے التجا کی ہے کہ بہ راہِ کرم امتِ مرحوم کی مشکلات آسان فرمادے اور انھیں ارجمند و باوقار کردے۔

مشکلیں اُمتِ مرحوم کی آساں کردے
مورِ بے مایہ کو ہم دوشِ سلیماں کردے

اقبال حال کے مسلمانوں کو ماضی کے مسلمانوں کی طرح ہر شعبۂ زندگی میں کام ران و باوقار دیکھنا چاہتے ہیں۔ وہ ان کے ادبار کو اقبال سے اور بدحالی کو خوش حالی سے بدلنے کے خواہش مند ہیں۔ نظم میں ماضی و حال کا تقابل اسی آرزو کا عکاس ہے۔ حالی کی طرح اقبال کا شمار بھی ان مشاہیر بہی خواہوں میں ہوتا ہے جو قومی مفاد کو ذاتی مفاد پر ترجیح دیتے ہیں۔ ان کی یہی ترجیح قومی احیا سے عبارت اس نظم کی شکل میں ظاہر ہوئی ہے۔ گو شکوہ کا مرکزی خیال حالی کی نظموں 'مسدس مدوجزرِ اسلام'، 'شکوۂ ہند' اور 'عرضِ حال' سے ماخوذ ہے، مطالب بھی ماخوذ ہیں، تاہم اقبال کے درد و اخلاص اور خاص اسلوب پر

مبنی پیش کش کی بہ دولت اسے قبول عام حاصل ہوا۔ اقبال نے جہاں متذکرہ نظم میں واقعیت نگاری کی، وہیں تخیل کی رنگ آمیزی بھی کی ہے تاکہ حقیقت کی تصویر میں لطافت اور جاذبیت پیدا ہو۔ علاوہ ازیں جدتِ بیان، شوخی و بے تکلفی، سوز و گداز، ماضی و حال کی تصویر کشی اور جذباتی انداز شکوہ کی ممتاز خصوصیات ہیں، جن کی بنیاد پر اسے اردو کی ایک اہم نظم قرار دیا گیا ہے۔

حالی کی طرح اقبال بھی یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمان اسلام سے انحراف اور اسلاف کے عدم اتباع کے نتیجے میں اپنے قبلے سے بہت دور جا پڑے ہیں، چناں چہ انھوں نے اپنی قوم کے بے مہار اور بے راہ رو کارواں کو راہِ راست پر لانے اور اسے منزلِ مقصود کا پتا دینے کے لیے اپنی شاعری کو جزوِ پیغمبری بنایا۔ اقبال کی فارسی و اردو شاعری قومی خیر خواہی و خیر سگالی اور راہ نمائی پر مبنی اسی جذبے کی ترجمان ہے۔ انھوں نے اپنے متعدد اشعار میں اسی لطیف جذبے کا اظہار کیا ہے۔

نغمہ کجا و من کجا، سازِ سخن بہانہ ایست سُوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را (۵)

اسی جذبے نے علامہ اقبال کو خدائے لم یزل سے قومی زوال کے نتائج اور آلام و مسائل کا شکوہ کرنے کی ہمت و جرأت بخشی ہے؛ جیسا کہ ان اشعار سے ظاہر ہوتا ہے:

ہے بجا، شیوۂ تسلیم میں مشہور ہیں ہم
قصۂ درد سناتے ہیں کہ مجبور ہیں ہم
سازِ خاموش ہیں، فریاد سے معمور ہیں ہم
نالہ آتا ہے اگر لب پہ تو مجبور ہیں ہم
اے خدا! شکوۂ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے

خوگرِ حمد کا یہ فریاد نما گلہ ذاتی نہیں؛ قومی ہے، انفرادی نہیں؛ اجتماعی ہے مگر اس اجتماعی گلے کی آواز میں اس کی اپنی آواز بھی ہم آمیز ہو گئی ہے اور ایسی ہم آمیز ہوئی ہے کہ دونوں آوازوں کا الگ الگ تشخص و تعین مشکل سا معلوم ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہی اس نظم کا امتیازی وصف ہے۔ بعض ناقدین نے نظم کے مباحث کو شاعر کی ذاتی کیفیات سے تعبیر کیا ہے جب کہ بعض نے انھیں عام مسلمانوں کے فکر و خیال کی ترجمانی قرار دیا ہے؛ لیکن اگر مذکورہ نظم کا اس کے تاریخی تناظر میں مطالعہ کریں تو وہ دونوں کا امتزاج

معلوم ہوتی ہے کیوں کہ اقبال عصری تقاضوں کے زیر اثر چاہتے ہیں کہ جس طرح یورپی اقوام ہر شعبۂ حیات میں کام یاب و باوقار اور مرفہ الحال ہیں؛ اسی طرح تمام مسلمان بھی ہر شعبۂ زندگی میں کام یاب ہوں اور انھیں بھی دنیا میں کوئی آبرومندانہ مقام حاصل ہو۔ نظم میں بیانِ مسئلہ کا جذباتی انداز اور مسلم و غیر مسلم اقوام کا حیثیتی تقابل اقبال کی اسی دلی خواہش کا عکاس ہے۔

ہر چند علامہ اقبال ''شکوہ'' میں مسلم اُمہ کو درپیش آلام و مسائل کے بیان میں اس امر پر اصرار کرتے ہیں کہ عصر حاضر کے مسلمان اپنے آباواجداد کی طرح خدا اور سول کے نام لیوا اور پیروکار ہیں اور ان کے دل آج بھی نورِ ایمان سے منور ہیں، لیکن اس ادعائی اصرار کے علی الرغم کہیں کہیں یہ احساس بھی موجود ہے کہ وہ زمانہ اور تھا جب کہ یہ زمانہ اور ہے، اب اسلامیوں میں وہ ذوق و شوق اور ایمانی جذبہ موجزن ہے نہ پہلی سی اعتقادی کیفیت جاگزیں ہے:

عشق کی، خیر، وہ پہلی سی ادا بھی نہ سہی
جادہ پیمائیِ تسلیم و رضا بھی نہ سہی
مضطرب دل صفتِ قبلہ نما بھی نہ سہی
اور پابندیِ آئینِ وفا بھی نہ سہی

اسی طرح:

وادیِ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا
قیس دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا
حوصلے وہ نہ رہے، ہم نہ رہے، دل نہ رہا
گھر یہ اجڑا ہے کہ تو رونق محفل نہ رہا

مندرجہ اشعار سے حالی کی عرضِ حال کی صدائے بازگشت آرہی ہے، جن میں اقبال انکار کے بعد تسلیم کرتے نظر آتے ہیں کہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ عالمی منظر نامہ تبدیل ہو چکا ہے اور اب مسلمان بھی ویسے نہیں رہے، جیسے کبھی تھے یا جیسا انھیں ہونا چاہیے۔ انسانی طبائع ہوں یا اذہان؛ عقائد ہوں یا جذبات؛ سماجی اقدار ہوں یا قومی طرزِ احساس، غرض کہ کوئی شے بھی اپنی پہلی حالت پر قائم نہیں رہ سکی۔ نیرنگیِ زمانہ نے ہر چیز ہی کو بدل دیا ہے مگر اشیا و احوال اور اقدار کی تبدیلی کے ناسازگار مظاہر ضروری اصلاح کا تقاضا کرتے ہیں۔ باایں ہمہ یہاں بھی اقبال اصلاح اور بہتری کے لیے اعمال کی ضرورت کی بہ جائے محض دینی عقائد کو کافی خیال کرتے ہیں۔

جہاں شکوہ کا موضوع اقبال کی دوسری نظموں سے مختلف ہے، وہاں اس کا لہجہ اور اندازِ بیان بھی منفرد ہے، جس کی بعض ناقدین نے بہت تحسین کی ہے۔ تحسین اس لیے کی کہ قبل ازیں خدا کی شان میں حمد لکھی جاتی یا عرضِ نجات کے لیے مناجات کہی جاتی تھی، جس میں شاعر کا انداز بیان نہایت عاجزانہ و مؤدبانہ ہوتا تھا؛ جب کہ شکوہ کا انداز واسوخت سے مماثل ہے جس میں لہجے کی شوخی، بے تکلفی اور طنز و تعریض کا رنگ غالب ہے۔ شکوہ کا یہی اندازِ بیان اسے اقبال کی دیگر نظموں سے ممیز کرتا ہے۔ سید وقار عظیم (۱۹۱۰۔۱۹۷۶ء) نے شکوہ کے اِسی منفرد لہجے اور انداز بیان کو سراہتے ہوئے اپنے جامع اور مفصل مضمون 'اقبال کی بعض نظموں کا لہجہ' میں اس طرح اظہارِ خیال کیا ہے:

> ''اس نظم میں اقبال کا لہجہ ویسا نہیں، جیسا دوسری پیغامی اور حکیمانہ نظموں میں ہے۔ لیکن لہجے کی جس بے تکلفی کو ہدفِ ملامت بنایا جاتا ہے، اتفاق سے وہی اس نظم کی سب سے اہم خصوصیت ہے اور اسی خصوصیت نے نظم میں بعض ایسی خوبیاں پیدا کی ہیں جو اقبال کی صرف اسی نظم میں ہیں.... اقبال نے خدا سے شکوہ کرتے وقت ذاتی احساسات و جذبات کی ترجمانی کی بجائے عام مسلمانوں کی آواز خدا تک پہنچانے کی خدمت اپنے ذمے لی ہے، اس لیے تلخی کے اظہار میں آواز کی لے عوام کی لے بن گئی ہے.... لہجے میں طنز کی جو تلخی ہے اس کا انداز احسان کر کے بہ بانگ دہل اسے جتانے اور اپنے مخاطب کو شرمندہ کرنے کا ہے۔ جس ذہنی اور جذباتی پس منظر میں یہ نظم لکھی گئی، اس کے عین مطابق ہے اور سچ پوچھیے تو یہ اندازِ تخاطب لطف سے خالی نہیں، اس لیے کہ اس کی بہ دولت نظم میں بلا کی روانی پیدا ہوئی اور کہیں کہیں ایسی شوخی بھی ہے، جس کی جست جو میں اچھے شعروں کے رسیا دیوانوں کے دفتر الٹتے پلٹتے ہیں۔''(۶)

سید وقار عظیم نے اقبال کے جس شوخ اور بے تکلفانہ لہجے اور انداز بیان کی تحسین میں اتنا مبالغہ کیا ہے، گو موضوع کی نزاکت کے لحاظ سے اس کا کوئی جواز نہیں ہو سکتا اور نہ اندازِ بیان کی محض شوخی و بے تکلفی کی بنیاد پر نظم کی قدر و قیمت کا تعین صحیح ہے کیوں کہ ایک تو شوخی و بے تکلفی اُسلوب کا ایک جزو ہے، کل نہیں اور دوسرا اس جزو کو کسی اور مضمون میں بھی تلاش کیا جا سکتا ہے۔ اس امر کے علی الرغم بعض ناقدین خاص اسی جہت سے شکوہ کی متنوع توضیح کرتے رہے ہیں۔

سید عابد علی عابد (۱۹۰۶۔۱۹۷۱ء) نے اپنے مقالہ 'شکوہ: ایک سلسلہ خیال کا تجزیہ' میں کسی تمہید یا تقریب کے بغیر اقبال کی خدا سے ہم کلامی کو یہ کہہ کر جواز فراہم کیا ہے کہ دیگر مذاہب کے برعکس اسلام میں خدا اور بندے کا تعلق ایسا ہے کہ اسے کسی واسطے کی ضرورت نہیں۔ اسی بنیاد پر انھوں نے شکوۂ اقبال اور اسی انداز کے دوسرے کلام کو عجمی افکار و تصورات سے تعلیماتِ اسلام کا چشمہ گدلا کرنے والے عرفان فروشوں اور بہ راہِ راست اللہ کی معرفت کا حصول ناممکن بنانے والوں کے خلاف ایک احتجاج سے تعبیر کیا ہے۔(۷) جب کہ دوسرے مقالہ 'جوابِ شکوہ: ایک سلسلۂ خیال کا تجزیہ' میں شکوہ کو اس کی بے تکلفی کی بنا پر شطحیاتِ صوفیہ سے نسبتاً کم گستاخانہ لکھا ہے، لہٰذا انسانی شکایت کے ردّ عمل میں فرشتوں کی حیرت پر اظہارِ تعجب کیا ہے۔(۸) سر عبدالقادر (۱۸۷۲۔۱۹۵۰ء) نے شکوۂ اقبال کو اس کے معانی، لہجے اور اُسلوب کے لحاظ سے قومی واسوخت قرار دیا ہے۔ مدیر مخزن نے مقالہ 'میر کی واسوخت اور اقبال کا شکوہ' میں متذکرہ نظموں کا تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے چند مماثلتوں کو اُجاگر کیا ہے۔ ان کے خیال میں دونوں معنوی اعتبار سے ایک دوسرے کے ضمیمے نظر آتے ہیں۔ شکوہ میں مضامین کی مناسبت کے ساتھ ساتھ طرزِ ادا بھی میر سے مستعار لی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ دونوں میں مضمون، لہجے اور اسلوب کی اتنی مماثلتیں ہیں کہ اس اعتراف میں چنداں مضائقہ نہیں کہ اقبال نے میر کی واسوخت سے خاطر خواہ استفادہ کیا ہے اور شکوۂ اقبال اور جوابِ شکوہ میں آوازِ میر ہی کی بازگشت ملتی ہے۔(۹) واسوخت بھی معنوی لحاظ سے ایک شکوہ ہی ہے اور جب یہ دونوں ایک ہی وزن، ہیئت اور اُسلوب میں مرتب ہوں تو مماثلت کا ہونا ایک فطری امر ہے، لہٰذا یہ توضیح معقول ہے۔ ایک توضیح شکوہ کی شرح میں محمد شریف بقا نے بھی کی ہے، جن کے قول کے مطابق:

> ''علامہ اقبال نے مسلمانوں کی طرف سے 'شکوہ' میں خدا کی بارگاہ میں جو محبت آمیز مگر یاس انگیز شکایات پیش کی ہیں، وہ زیادہ تر عام مسلمانوں کے اعتقادات اور تصورات کی صدائے بازگشت ہیں۔ ان کو بیان کرنے کے لیے شاعر نے جوانداز تخاطب اختیار کیا ہے، وہ کسی قدر بے باک بھی ہے اور احترام آمیز بھی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا کی وحدانیت، عظمت اور احترام سے آگاہ مسلمان، خدا تعالیٰ کی بارگاہِ نیاز میں گستاخانہ کلام کے ذریعے عرضِ مدعا کرے۔ اقبال نے خدا کی بارگاہ میں جو شکایات بیان کی ہیں، وہ

حقیقت میں اقبال کی ذاتی شکایات نہیں بل کہ انھوں نے عام مسلمانوں کے اندازِ فکر کی ترجمانی کی ہے۔اس اظہار شکایت کے ذمہ دار تمام مسلمان ہیں نہ کہ اقبال۔الخ"(۱۰)

یہ توضیح خلافِ حقائق ہے، جس میں سید وقار عظیم کے خیال ہی کا عکس ملتا ہے۔ یہاں تسلیم حقیقت سے مفر نہیں اور حقیقت کا ایک رخ یہ ہے کہ محاسن نظم سے قطعِ نظر 'اقبال کا طرزِ شکایت طعن و تعریض سے مملو ہونے کے باعث گستاخانہ ہے۔ خود انھیں بھی اس کا احساس دامن گیر ہوا کہ انھوں نے عرضِ مدعا میں خدا کی کبریائی اور اپنی بندگی کے تقاضوں کا کوئی لحاظ نہیں کیا، ورنہ وہ شاید جوابِ شکوہ نہ لکھتے۔ حقیقت کا دوسرا رخ یہ ہے کہ کوئی بھی ادب پارہ محض کسی سماجی ترغیب پر تخلیق پذیر ہوتا ہے نہ کسی شخص کے خیالات و جذبات ہی اس کی تخلیق کا بدیہی محرک بنتے ہیں تاآں کہ تخلیق کار خود تخلیقی عمل میں ان خیالات و جذبات کی بعینہٖ بازیافت نہ کرے، جنھیں وہ ایک ادب پارے کا روپ بخشتا ہے۔ بالفاظِ دیگر ہر بڑا فن پارہ، فن کار یا تخلیق کار کا اپنا تخلیقی تجربہ ہوتا ہے؛ خواہ شاعری ہو یا موسیقی؛ مصوری ہو یا بت تراشی۔ عموماً انسانی زندگی اور سماج کے خارجی اُمور واحوال ہر بڑے فن کار کے ہاں داخلی کیفیات و تجربات کی شکل میں ڈھلتے اور کسی فنی شاہ کار کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ اس سیاق و سباق میں نقادوں کے اس موقف ہی کو معتبر قرار دیا جا سکتا ہے جس میں خدا کے حضور اقبال کی شکوہ سنجی کے شوخ وطنزیہ لہجے کو 'عوام کی لے' اور 'نظم کی سب سے اہم خصوصیت' قرار دیا گیا ہے اور نہ مدلل مدّاحی کے شوقین ادبا کے اس نقطۂ نظر ہی کو معقول مان کر اس کی کوئی تائید کی جا سکتی ہے، جس میں شکوۂ اقبال کو 'عام مسلمانوں کی آواز' اور 'عام مسلمانوں کے اعتقادات و تصورات کی صدائے بازگشت' قرار دے کر جوازِ تحریر فراہم کیا گیا ہے۔ اگر بات مخاطب کے مقام اور مقتضائے حال کے مطابق کہنا تہذیب ہے تو یہ اندازِ بیان خلافِ تہذیب ہے اور اسے کسی کا جائز کہنا عذرِ گناہ بدتر از گناہ کے مصداق ناروا ہے۔ ذیل میں نظم 'شکوہ' سے چند اشعار نمونے کے طور پر درج کیے جاتے ہیں، جن میں خدا سے اقبال کا طرزِ خطاب ترش اور تعریض آمیز ہونے کی وجہ سے قابلِ گرفت ہے:

اے خدا! شکوہ اربابِ وفا بھی سن لے
خوگرِ حمد سے تھوڑا سا گلا بھی سن لے

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

خندہ زن کفر ہے، احساس تجھے ہے کہ نہیں
اپنی توحید کا کچھ پاس تجھے ہے کہ نہیں

طعنِ اغیار ہے، رسوائی ہے، ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

کبھی ہم سے کبھی غیروں سے شناسائی ہے
بات کہنے کی نہیں، تو بھی تو ہرجائی ہے

غیر حقیقی وجوہِ شکایت اور تعریض آمیز طرزِ تخاطب سے قطعِ نظر شکوہ فکری وفنی جہات سے اقبال کی ایک دل پذیر اور خوب صورت نظم ہے، جس میں انھوں نے قومی وملی احیا کی غرض سے ایک شکایت کی صورت میں اسلامی تمدن کے زوال کا اثر انگیز نوحہ پیش کیا ہے۔

جوابِ شکوہ کا تعارفی وتنقیدی جائزہ

جیسا کہ عنوان سے ظاہر ہے، جوابِ شکوہ اقبال کی شکوہ کے جواب میں لکھی ہوئی ایک طویل نظم ہے۔ مولانا غلام رسول مہر (۱۸۹۳۔۱۹۷۱ء) کے بہ قول ڈاکٹر اقبال نے یہ نظم ۳۰/نومبر ۱۹۱۳ء کو متاثرین جنگ بلقان کی مالی امداد کے سلسلے میں بعد از نمازِ مغرب بیرون موچی دروازہ منعقدہ جلسہ عام میں سنائی۔ نظم کی نظرِ ثانی میں اس کے بعض بند قلم زد کر دیے گئے اور بعض بندوں کی ترتیب بھی بدل دی گئی (۱۱)، کیوں کہ نظم کی ترمیم اور ترتیبِ نو اس کے مطالب کی پیش کش کا اقتضا تھا۔

'جوابِ شکوہ' کے مطالب کا اجمال یہ ہے کہ نظم کے ابتدائی پانچ بند شکوہ سنج شاعر کی شکوہ سنجی کے رد عمل میں عالم ملکوت کے تجسس آمیز تاثرات پر مشتمل ہیں۔ چھٹا بند جوابِ شکوہ کا افتتاحیہ ہے، جس میں شاعر اپنی شکایت کا اللہ کی جانب سے جواب زیر بحث لایا ہے۔ باقی تمام نظم اسی کی توضیح ہے۔

یہاں ضمیمہ مسدس کی چند تلمیحات کا انھی مفاہیم میں استعمال ہوا ہے۔ ساتویں سے سترھویں بند میں ملی زوال کے اسباب بیان کیے ہیں اور سرِ فہرست دین سے دُوری اور بے عملی بتائی ہے۔ اٹھارھویں سے پچیسویں بند کے اشعار میں اخلاق واعمال کے لحاظ سے اخلاف کا اسلاف سے موازنہ کر کے دونوں میں امتیاز قائم کیا ہے۔ اسی موازنے میں شاعر کے بلند بانگ دعووں کا ابطال بھی کیا ہے اور اسلاف کی وقیع اسلامی خدمات کو اخلاف سے منسوب کرنے اور ناروا طور پر کریڈٹ لینے کی مذمت بھی کی ہے۔ مذمت کا انداز متین اور فہمائش آمیز ہے۔ یہ مذمت اس لیے ضروری سمجھی گئی کہ اس کے بغیر جوابِ شکوہ کا استدلال ممکن نہ تھا۔ چھبیسویں سے اکتیسویں بند کے اشعار رجائیہ ہیں، جن میں مسلمانوں کی بدحالی کے بیان سے پیدا ہونے والے حزنیہ تاثرات کا ازالہ کرتے ہوئے حالات کی تبدیلی اور روشن مستقبل کی نوید سنائی ہے۔ اسی کی توسیع میں بتیسویں سے چھتیسویں بندوں کے اشعار تحریک وترغیب سے عبارت ہیں۔ اقبال کا قوم کو بہی خواہانہ مشورہ ہے کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے فردا کا انتظار اور اپنی تقدیر پر بے جا انحصار کرنے کی بہ جائے قوتِ فکر وعمل کو بروے کار لانا چاہیے کیوں کہ موزوں حکمت عملی اور مؤثر تدبیر ہی سے عصری امور ومسائل کا حل ممکن ہے۔ یہاں اقبال نے عمل کے ساتھ عشق کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے۔ اقبال کے مطابق ایک مومن کو عشقِ رسول سے متصف ہونا چاہیے کیوں کہ عشقِ رسول اطاعتِ رسول کا تقاضا کرتا ہے اور اطاعتِ رسول رضاے الٰہی کے حصول کا ذریعہ ہے، جو اُسے ہر امر میں سرخ رو کرتی ہے۔ اقبال کے نزدیک عشق مؤمن کا ایسا جذبہ ہے، جسے ایک مؤثر حربے کے طور پر بروے کار لانے سے یہ جہان ہی نہیں، تقدیر بھی اس کے آگے سرنگوں ہو سکتی ہے اور کائنات کی ہر شے اس کے دائرۂ اختیار اور تصرف میں آسکتی ہے:

کی محمد سے وفا تو نے، تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح وقلم تیرے ہیں

شکوہ خطاب الی اللہ ہے جب کہ جواب شکوہ خطاب من جانب اللہ ہے۔ اقبال نے شکوہ میں مسلم اُمہ کے تنزل پر شکایت کی صورت میں جو جو نقاط اور سوالات اٹھائے تھے، اس نظم میں ان کا خدا کی زبان سے تسلی بخش جواب دیا گیا ہے۔ جہاں اقبال کی شکوہ کو سخن فہم اور باذوق لوگوں کی طرف سے بہت

سراہا گیا، وہیں بعض علما و ادبا کی جانب سے اس کی اشاعت کے خلاف ایک شدید ردّ عمل بھی آیا۔ اسی رد عمل میں بعض شعرا نے جوابی نظمیں بھی لکھیں۔ان نظموں کا خلاصہ یہ ہے کہ جب تک مسلمانوں نے کتاب و سنت پر مکمل طور پر عمل کیا، وہ قابل رشک ترقی کرتے رہے اور جب کتاب و سنت سے کنارہ کر لیا تو وہ دنیا میں سبک سر ہو کر رہ گئے۔ گویا کہ اہل اسلام کا زوال ان کے اپنے ہاتھوں ہی کی کمائی ہے، جسے اللہ کے عدم الطاف پر محمول کرنا مناسب نہیں ہے۔ چوں کہ اقبال نے شکوہ میں چند سوال اٹھائے تھے چناں چہ ان نظموں میں ان کے جواب دیے گئے۔ اسی تناظر میں اقبال کو بہ طورِ اعتذار جوابِ شکوہ لکھنا پڑی۔ متذکرہ نظموں کا موضوع ایک ہے لیکن ان کا بیانیہ جدا جدا ہے۔ جوابِ شکوہ میں اقبال نے شکوہ کے برعکس مسلم امہ کو اس سیاسی و تہذیبی انحطاط کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور اس انحطاط پر منتج جن تلخ حقائق سے شکوہ میں یاس انگیزی کے خدشے سے صرفِ نظر کیا تھا، انھی کو موضوع بنایا ہے۔ اقبال نے شکوہ میں قومی تفوق کے عقیدے کے تحت فروغِ اسلام کے لیے اسلاف کے کارناموں کا تفاخر آمیز تذکرہ کیا اور اس کے ساتھ ہی اخلاف کے زوال کی درد بھری داستان بیان کی تھی، جب کہ جوابِ شکوہ میں ماضی و حال کا موازنہ کر کے قومی زوال کے بنیادی اسباب بیان کیے ہیں، نیز مسلمانوں میں مغربی اور ہندی تہذیب و ثقافت کے زیر اثر پیدا ہونے والے چند قابل ذکر معائب کی نشان دہی کر کے قومی ضمیر کو خوب جھنجوڑا ہے:

ہر کوئی مستِ مئے ذوقِ تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو؟ یہ اندازِ مسلمانی ہے؟
حیدری فقر ہے، نے دولتِ عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے؟

اقبال کا شکوہ سیاق و سباق کے لحاظ سے اسلاف اور اخلاف کے مابین حیثیتی تفاوت سے پیدا ہوا، جس کے متعلقہ حقائق کا بیان شکوہ میں قابل اعتنا نہیں جانا گیا مگر جواب شکوہ میں حیثیتی تفاوت کے انھی حقائق کو ناقدین کے اعتراضات دور کرنے کی غرض سے ناچار زیر بحث لانا پڑا۔ ان حقائق کا بیان اس لیے بھی ضروری تھا کہ بہ صورت دیگر قومی احیا کی آرزو کی حقیقی ترجمانی ممکن نہیں تھی۔ یعنی اقبال نے

متذکرہ نظم میں قومی وقار کی بحالی کی غرض سے ان تہذیبی و تمدنی احوال کا جائزہ مرتب کیا ہے، جن کے اثرات سے مسلمانوں کی قومی حیثیت تبدیل ہو گئی اور وہ حاکم سے محکوم اور غالب سے مغلوب ہو کر ترقی کی دوڑ میں متمدن اقوام سے پیچھے رہ گئے۔ شاعر نے اپنی نظم کے آخر میں قومی اعزاز و وقار کی بحالی اور فلاح و ترقی کے لیے چند مفید تجاویز بھی دی ہیں۔ قصۂ مختصر زیر مطالعہ نظم ایک پیغامِ عمل ہے، جس میں شاعر نے عصری حالات و واقعات کے تناظر میں پس ماندہ اور بد حال قوم کو آئنہ دکھایا ہے تاکہ وہ اپنے اسلاف کو اپنے لیے نمونۂ عمل بناتے ہوئے قابلِ اصلاح حالات کی اصلاح کر لے اور قوائے فکر و عمل کو احسن طور پر بروئے کار لاتے ہوئے اپنے ادبار کو اقبال سے اور اپنے زوال کو عروج سے بدل لے۔ اقبال کے نظامِ فکر کی تشکیل میں جواب شکوہ اور شمع اور شاعر بنیادی حیثیت کی حامل نظمیں ہیں۔

منتخب نظموں کا تقابلی مطالعہ: مماثلتیں اور امتیازات

ملی نشاۃِ ثانیہ کی آرزو حالی و اقبال کی قدرِ مشترک ہے، لہٰذا حالی کی نظم عرضِ حال اور اقبال کی شکوہ و جواب شکوہ کا مرکزی خیال اور مباحث مماثل ہیں۔ ان کی تخلیق کے اسباب اور مقاصد بھی ایک سے ہیں اور ان کا تاریخی پس منظر بھی کم و بیش ایک سا ہے۔ حالی نے جب ۱۸۸۸ء میں عرضِ حال لکھی تھی تو برّصغیر سمیت متعدد ممالک پر انگریز حکم ران تھے اور جب اقبال نے ۱۹۱۱ء میں شکوہ اور ۱۹۱۳ء میں جواب شکوہ لکھی تھی تو اس وقت بھی انھی کے اقتدار کا سورج چمک رہا تھا۔ حالی کے عہد میں بھی مسلمان علمی، سیاسی اور معاشی طور پر پس ماندہ تھے اور اقبال کے دور میں بھی وہ ہر لحاظ سے پس ماندگی کی زندگی گزار رہے تھے۔ ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی نے ہر شعبۂ حیات میں مسلمانانِ ہند پر مہلک اثرات مرتسم کیے جو مدتوں قائم رہے۔ انگریز حکومت نے استحصالی پالیسیوں کے نفاذ سے ترقی و خوش حالی اور قومی وقار کو مسلمانوں کے لیے ایک بھیانک خواب بنا دیا۔ دیگر ممالک کے مسلمانوں کا حال بھی چنداں مختلف نہیں تھا۔ ترکی، مصر، عرب، افریقہ، ایران اور ہندوستان میں انگریزوں کی سازشوں کے ذریعے حکومتوں کی شکست وریخت، داخلی خلفشار، اقتصادی بدحالی اور سیاسی انتشار کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مایوسی، بے عملی، اضطراب اور دیگر مسائل جہاں مسدسِ حالی، شکوۂ ہند اور عرضِ حال کی تخلیق کے عوامل ہیں، وہاں شکوہ، جواب شکوہ، شمع اور شاعر اور بعض دوسری نظموں کی تصنیف کے

بھی محرکات ہیں۔ یہ نظمیں پر آشوب ادوار کے یکساں سیاسی و معاشی اور سماجی مسائل سے عبارت ہیں، مگر سانحۂ کانپور، جنگِ بلقان وطرابلس اور ان کے نتیجے میں وقوع پذیر جانی ضیاع اور سیاسی و جغرافیائی تبدیلیاں، عربوں اور ترکوں میں فروغ پذیر قوم پرستی اور بین العلا قائی تنازعات و مناقشات، اقبال کی متذکرہ نظموں کے مستزاد عوامل ہیں۔

بالعموم ہم موضوع طویل نظموں کے تقابلی مطالعے میں، اگر ان کی ہیئت اور اسالیب ایک دوسرے سے مختلف ہوں تو ان کے ہر شعر کا موازنہ ممکن نہیں ہوتا، لہٰذا ان کے موضوع اور مباحث کا مجموعی جائزہ لیا جاتا ہے۔ یہاں بھی یہی طریق کار اختیار کیا گیا ہے؛ تاہم زیر مطالعہ نظموں سے چند منتخب اشعار بھی نقل کیے جاتے ہیں، جن میں موضوعاتی اشتراک یا معنوی مماثلت موجود ہے اور ذوقِ سلیم کی بہ دولت اس کا مناسب ادراک کیا جاسکتا ہے۔

عرضِ حال:

وہ قوم کہ آفاق میں جو سر بہ فلک تھی
وہ یاد میں اسلاف کے اب رُو بہ قضا ہے
جو قوم کہ مالک تھی علوم اور حکم کی
اب علم کا واں نام نہ حکمت کا پتا ہے
جو دین کہ تھا شرک سے عالم کا نگہباں
اب اس کا نگہبان اگر ہے تو خدا ہے
کھوج ان کے کمالات کا لگتا ہے اب اتنا
گم دشت میں اک قافلہ بے طبل و ذرا ہے

شکوہ:

وادیِ نجد میں وہ شورِ سلاسل نہ رہا
قیس دیوانۂ نظارۂ محمل نہ رہا
حوصلے وہ نہ رہے، ہم نہ رہے، دل نہ رہا
گھر یہ اجڑا ہے کہ تو رونق محفل نہ رہا

جوابِ شکوہ :

ہاتھ بے زور ہیں، الحاد سے دل خوگر ہیں
اُمتی باعثِ رسوائیِ پیغم بر ہیں

بت شکن اٹھ گئے، باقی جو رہے بت گر ہیں
تھا براہیم پدر اور پسر آزر ہیں

....

تھے تو آبا وہ تمھارے ہی مگر تم کیا ہو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظرِ فردا ہو
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

عرضِ حال:

جس دین نے غیروں کے تھے دل آکے ملائے
اس دین میں خود بھائی سے اب بھائی جُدا ہے
جو تفرقے اقوام کے آیا تھا مٹانے
اس دین میں اب تفرقہ خود آکے پڑا ہے

جوابِ شکوہ:

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

عرضِ حال:

ہے دین ترا اب بھی وہی چشمۂ صافی
دیں داروں میں اب آب ہے باقی نہ صفا ہے
عالم ہے سو بے عقل ہے، جاہل ہے سو وحشی
منعم ہے سو مغرور ہے، مفلس سو گدا ہے
یاں راگ ہے دن رات تو واں رنگ شب و روز
یہ مجلسِ اعیاں ہے، وہ بزمِ شرفا ہے

جوابِ شکوہ:

ہر کوئی مستِ مے ذوقِ تن آسانی ہے
تم مسلماں ہو، یہ اندازِ مسلمانی ہے؟
حیدری فقر ہے، نے دولت عثمانی ہے
تم کو اسلاف سے کیا نسبت روحانی ہے؟
وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

عرضِ حال:

کر حق سے دُعا اُمت مرحوم کے حق میں
خطروں میں بہت جس کا جہاز آکے گھرا ہے

شکوہ:

مشکلیں اُمت مرحوم کی آساں کر دے
مورِ بے مایہ کو ہم دوشِ سلیماں کر دے

ادبیاتِ اردو میں حالی، اقبال کے بااثر پیش رو ہیں۔ حالی نے اقبال سمیت متعدد شعرا و ادبا کو متاثر کیا، یہی امر ان کے کلام میں مماثلت کی اساس ہے۔ حالی و اقبال کی ذہنی و طبعی موافقت، مماثل تاریخی تناظر اور افادی نظریۂ ادب رکھنے کی وجہ سے دونوں شعرا کی نظموں میں مضامین کا اشتراک ملتا ہے۔ مثال کے طور پر طلوعِ اسلام، اشاعتِ دین، تمدنی ترقیات، فروغِ اقدار، اشاعت علوم، قومی عروج اور عروج کے بعد زوال، اقتدار سے محرومی، تہذیبی پس ماندگی، جہالت، انفعالیت اور ان سب مسائل کے منطقی ردّ عمل کے طور پر پیغام عمل اور نشاۃ ثانیہ کی آرزو؛ یہ مضامین مدوجزرِ اسلام، شکوۂ ہند اور عرضِ حال میں بھی ادا ہوئے اور کم و بیش شکوہ، جوابِ شکوہ اور شمع و شاعر میں بھی بیان ہوئے ہیں۔ اگر مطالعۂ حالی کے بعد اقبال کا مطالعہ کریں تو ان کی نظموں میں حالی کی صدائے بازگشت سنائی دیتی ہے۔ بایں ہمہ دونوں شعرا کے کلام میں چند اہم امتیازات بھی موجود ہیں۔ اولین امتیاز عرض حال اور شکوہ میں

قومی زوال کی مختلف فیہ تاویل ہے۔ حالی کے مطابق زوال خود مسلمانوں کے اعمال کا شاخسانہ ہے، جب کہ اقبال اسے خدا کی نامہربانی پر محمول کرتے ہیں۔ ان نظموں میں ایک یہ امتیاز بھی ہے کہ حالی کے مخاطب نبی کریم ﷺ ہیں کیوں کہ حالی کے عقیدے کے مطابق ہر دکھ کا دارو اور ہر زخم کا مرہم صرف حضور ﷺ ہی سے مہیا ہو سکتا ہے۔ حالی کے نزدیک حضور ہی امت کی کشتی کو متلاطم موجوں کے تھپیڑوں سے بچا کر ساحلِ مراد پر لا سکتے ہیں۔ بہ خلاف ازیں اقبال کا مخاطب اللہ تعالیٰ ہے جو خود قرآں کریم (۴۰:۶۰) میں ہمیں صرف معبودِ حقیقی کو پکارنے اور اسی سے مانگنے کا حکم دیتا ہے۔ اقبال نے اسی حکم کی روشنی میں اللہ سے بہ راہِ راست خطاب کیا ہے۔ وہ مسائل کے حل اور استعانت کی غرض سے مشرک اقوام کی طرح خدا اور بندے کے مابین مرئی واسطوں کو بروے کار نہیں لائے۔ زیر مطالعہ نظموں کے لہجے اور انداز بھی ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ حالی کا لہجہ مناجات نما ہے۔ عرضِ حال ایک استغاثہ ہے؛ لہٰذا حالی نے ایک فریادی کا سا انداز اپنایا ہے اور جہاں ان کا انداز گلہ مندانہ اور لہجہ تلخ ہوا، وہیں انھوں نے اپنی فریاد کو تمام کر دیا ہے۔ دوسری طرف اقبال کا انداز طنزیہ اور لہجہ جذباتی ہے۔ اللہ سے شکوہ سنجی میں اس کی الوہیت اور اپنی عبدیت کا لحاظ نہیں کیا گیا۔ اللہ کے احسانات ماننے کی بہ جائے الٹا احسان جتائے گئے ہیں۔ ربّ کریم کی شانِ کریمی پر سوالیہ نشان لگا دیا گیا ہے۔ شکوے ایسے کیے گئے ہیں، جیسے کسی بے وفا آشنا سے اس کی بے وفائی کے گلے کیے جاتے ہیں۔ بعض اشعار میں واسوخت کا رنگ جھلکتا ہے۔ حالی نے مسدس و عرضِ حال میں مسلمانوں کے جملہ سماجی طبقوں میں موجود نقائص کی بلا امتیاز نشان دہی کی اور انھی نقائص کی بنیاد پر انھیں زوال کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ حالی جیسے قوم کے ہم درد اور خیر خواہ محض قومی محبت اور خیر خواہی کے تحت قوم کی تنقیص پر مجبور ہوئے اور تحسین سے معذور رہے کیوں کہ ان کی نظر میں ایک بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح کے لیے اسے آئنہ دکھانا بہت ضروری تھا۔ اسی ضمن میں انھوں نے نظموں میں اسبابِ زوال کا تجزیہ بھی کیا ہے۔ بہ خلاف ازیں اقبال نے شکوہ میں 'پدرم سلطان بود' کے مصداق اشاعتِ اسلام کے لیے اسلاف کے فخریہ انداز میں کارنامے بیان کیے ہیں جب کہ اخلاف میں پیدا ہونے والی جملہ منفی تبدیلیوں اور قباحتوں سے مکمل اغماض کیا ہے۔ اسی طرح مسلم اور غیر مسلم کے حیثیتی امتیاز کو زیر بحث لا کر اس کے پیدا ہونے کی حقیقی وجوہات کو

نظر انداز کر دیا ہے۔ الٹا یہ تاثر پیش کیا ہے کہ کفار خوش حال اور خدا کی نوازشوں سے فیض یاب ہیں جب کہ مسلمان خدا کے زیر عتاب ہیں۔ گویا کہ شاعر میں حقیقتِ حال کا سامنا کرنے کا حوصلہ نہیں۔ یہاں حالی اور اقبال کے موضوع کی مماثلت کے باوجود دونوں کے نقطۂ نظر کا اختلاف 'عرضِ حال' اور 'شکوہ' میں مابہ الامتیاز ہے۔ ماضی و حال کے تقابل میں اقبال کا ارتکاز محض ماضی کی روشن تصویر پیش کرنے ہی پر رہا ہے۔ اسی ضمن میں اقبال نے اس عقیدے کی بھی ترجمانی کی ہے کہ قومی امتیاز و تفوق مذہبی نسبت سے ہے نہ کہ عمل سے۔ اقبال کا عقیدہ ہے کہ مسلمان نبی کریم ﷺ کے امتی ہونے کی نسبت سے خیر الامم ہیں، لہٰذا کسی قوم سے کسی طرح کم تر نہیں ہو سکتے، فوز و فلاح، اقتدار اور وقار بلا اعمال ان کا حق ہے، وہ ہر قسم کے امتحان اور مؤاخذے سے مستثنیٰ ہیں اور ان پر کسی قانون کا اطلاق نہیں ہوتا۔ یہود و نصاریٰ بھی ایسا عقیدہ رکھتے ہیں، جس کا ذکر اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اور مؤرخین نے تاریخ میں کیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہود کا عقیدۂ تفوق نسلی امتیاز پر استوار ہے۔ بالعموم کسی قوم میں یہ عقیدہ اس وقت پیدا ہوتا ہے، جب وہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے رسول یا سربراہِ نسل کے توسل سے کسی ممتاز مقام سے سرفراز ہوتی ہے۔ قومی تفوق کا تصور سامی ہو یا آریائی، خلاف اسلام ہے۔ اس کے باوجود شکوۂ اقبال میں یہی عقیدہ کارفرما ہے۔ جب ملک میں اقبال کی اسی عقیدے کی ترجمانی کے خلاف احتجاج ہوا، اور خود انھوں نے بھی شکوہ پر نظر ثانی کی تو اپنی سوچ تبدیل کر لی اور جواب شکوہ میں حقائق کا ادراک کرتے ہوئے وہی متخالف موقف اختیار کر لیا جو اُن سے قبل حالی اپنی نظموں میں متواتر بیان کر چکے تھے کہ قوم کا اقبال مندی سے محروم ہونا اور بلندی سے پستی میں جا گرنا، نوشتۂ تقدیر یا خدا کی نامہربانی نہیں بل کہ خود اُسی کی بے عملی، فرائض سے پہلو تہی اور اسلامی اقدار و احکام سے روگردانی کرنے کا نتیجہ ہے۔ مزید یہ کہ زوال کوئی ناگہانی آفت یا حادثہ نہیں جو اچانک واقع ہو گیا ہو، بل کہ سال ہا سال کے اعمال کی پیداوار ہے۔ اس تناظر میں اقبال کا اصرار ہے کہ اس زوال کے اثرات سے نجات اور ترقی و وقار کے حصول کے لیے خدا اور سول سے وفاداری اور ان کے احکام کی روشنی میں جد و جہد ناگزیر ہے۔ شکوہ میں اقبال نے خدا کے حضور ترقی و کامرانی اور باوقار زندگی کے لیے اپنا استحقاق پیش کیا تھا، جب کہ جوابِ شکوہ میں اسی استحقاق سے یک سر دست بردار ہو کر اس حقیقت کو قبول کر لیا ہے کہ ترقی و کامرانی انسان کی اپنی محنت

اور عمل پر موقوف ہے، لہٰذا حالات کی سنگینی کے مطابق مسلمان قوم کو جہد و عمل کا درس اور امید کا پیغام دیا ہے۔ اقبال کے نزدیک اقوام کی زندگی میں نشیب و فراز آتے رہتے ہیں، وقت کا دریا سدا ایک ہی سمت میں نہیں بہتا، مگر تبدیلی لانے اور حالات کو سازگار بنانے کی غرض سے انسان کا میدانِ عمل میں اترنا لازم ہے۔ یہاں اقبال نے حالی اور ظفر علی خاں کی طرح اس قانونِ قدرت کی ترجمانی کی ہے کہ خدا اسی قوم کی حالت بدلتا ہے، جو خود تبدیلِ احوال کے لیے برابر کوشش کرتی ہے۔

الغرض عرضِ حال اور جواب شکوہ میں پس ماندہ اور خراب حال قوم کو آئینہ دکھایا گیا ہے تاکہ وہ اپنے بگڑے ہوئے خط و خال بہ غور ملاحظہ کرے اور ایک نئے جذبے سے اصلاح پذیر احوال کی اصلاح کر کے جادۂ ترقی پر پھر سے گام زن ہو جائے۔

یہاں اسالیب کا امتیاز بھی قابلِ ذکر ہے۔ حالی کا اسلوب ان کی شخصیت کا عکاس ہے۔ ان کی نظم میں ان کے مزاج کی طرح سادگی، متانت اور سوز و گداز جیسی خصوصیات ملتی ہیں۔ روانی و سلاست بھی فراواں ہے۔ اگرچہ بعض شعروں میں مشکل وزن اور ہیئت کے استعمال سے تعقید بھی در آئی ہے، تاہم وہ ابلاغ میں مانع نہیں۔ شعر کی سماجی افادیت کے تحت حالی کی بیش تر توجہ ابلاغ پر مرکوز رہی ہے۔ اسی لیے انھوں نے شاعری کے فنی اور جمالیاتی پہلوؤں کو زیادہ اہم اور قابلِ ترجیح نہیں جانا۔ حالی کو گزارشِ احوالِ واقعی منظور ہے، اپنا بیانِ حسنِ طبیعت مقصود نہیں۔ تاہم جہاں کہیں اصل زبان کا قافیہ تنگ ہو گیا یا سادہ نگاری کام نہیں آسکی، وہاں حالی نے مقتضائے حال کے مطابق محاوروں، استعاروں اور تلمیحوں کے ذریعے عمدگی سے قومی حالات کی عکاسی اور جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ بہ خلاف ازیں اقبال نے انفرادیت پسندی کے تحت اپنی نظموں میں مشکل اور پُر تکلف اسلوب اختیار کیا ہے۔ حالی و اقبال کی منظومات کی تلمیحات کم و بیش ایک سی ہیں کیوں کہ ان کا تاریخی تناظر ایک سا ہے لیکن ان کی تشبیہات اور استعارات جدا جدا ہیں۔ علامہ اقبال کی نظموں میں تشبیہ و استعارہ اور صنائع کا استعمال فراواں ہے۔ طرزِ بیان میں بے تکلفی برتنے کے باوجود بعض شعروں میں تکلف و تصنع کا رنگ نمایاں ہے۔ تاہم متذکرہ نظموں کے درسی نصابات میں شامل ہونے اور کثرتِ مطالعہ کے باعث بعض شعروں کا تصنع زیادہ ناخوش گوار معلوم نہیں ہوتا۔ اسی طرح کہیں کہیں مشکل تراکیب کے استعمال سے ثقالت بھی

پیدا ہوئی ہے اور کہیں کہیں ابہام بھی در آیا ہے۔اس پہلو سے قطع نظر، گو شاعری اقبال کے لیے ایک ذریعۂ ابلاغ ہے، تاہم اقبال تخلیق کار کی حیثیت سے فکر کے ساتھ ساتھ فنی اور جمالیاتی جہات کو بھی ترجیح دیتے ہیں۔اقبال عموماً نظم گوئی میں نظم کے موضوع اور معنی کے مطابق جداگانہ فنی تقاضوں کا التزام کرتے ہیں۔اسی سے ان کی نظم میں تنوع اور انفرادیت کی شان پیدا ہے۔ یہاں بھی اقبال نے نظم کے موضوع اور اس کے ضمنی مطالب کے مطابق لب ولہجہ اور اندازِ بیان اختیار کیا ہے۔اگرچہ دونوں نظموں کا موضوع ایک ہے مگر ان کے ضمنی مطالب متعدد ہیں؛ چناں چہ جہاں مطالب بدلتے ہیں، وہیں اندازِ بیان، لہجہ اور مزاج بھی بدل جاتا ہے۔ شکوہ کا مزاج اور لہجہ ابتدا میں جذباتی، پھر طنزیہ اور آخر میں حزنیہ ہے، جب کہ جوابِ شکوہ کا مزاج اور لہجہ ابتدا میں تجسس آمیز، پھر متین و سنجیدہ اور آخر میں رجائیہ ہے۔اقبال نے اپنی نظموں کے لیے بحر رمل مثمن مخبون محذوف کا استعمال کیا ہے جو متین افکار و جذبات کے اظہار کے لیے انتہائی موزوں پیمانہ ہے۔اسی لیے غالب، اقبال اور فیض سمیت بیش تر شعرا کا مرغوب ترین وزن شمار ہوتا ہے۔اقبال نے یہاں اس کا ماہرانہ استعمال کیا ہے۔وزن کی طرح ہیئت بھی نظم کے مطالب سے میل کھاتی ہے۔ شکوہ اور جواب شکوہ مسدس ترکیب بند میں مرتب ہیں۔ان کے علاوہ ہمالہ، گل رنگیں، عہدِ طفلی، گل پژمردہ، مرزا غالب، نالۂ فراق اور وطنیت بھی اسی ہیئت میں لکھی ہوئی نظمیں ہیں۔(۱۲)ان نظموں کی ہیئتی بنیاد حالی کی فراہم کردہ ہے جو اس امر کی محکم دلیل ہے کہ اقبال ہیئتی امور میں بھی حالی سے بہت متاثر ہوئے ہیں کیوں کہ ان سے پہلے حالی نے مدوجزرِ اسلام، مرثیہ حکیم محمود خاں اور ننگِ خدمت جیسی نظمیں اسی ہیئت میں لکھی تھیں۔ادب میں حالی کی یہ نظمیں ان کی تاریخی و عصری آگہی، قومی شعور اور فکری و تخلیقی صلاحیتوں کا شاہ کار مانی گئی ہیں۔ یہ نظمیں فکر و فن کا حسین امتزاج ہیں، جن میں موضوع کی مناسبت سے ہیئت اور اسلوب کا استعمال کیا گیا ہے۔ برصغیر میں حالی کی ان رجحان ساز نظموں کی کثیر اشاعت کی بہ دولت مسدس ترکیب بند کے موضوعاتی امکانات روشن ہو گئے اور صدہا نظمیں حالی کے زیر اثر مسدس میں لکھی گئیں۔اسی فروغ پذیر رجحان کے تحت مسدس اس دور کی اردو نظم کی ایک مقبول ہیئت بن گئی اور نظم گو شعرا کی دل چسپی کے باعث شاعری کا ایک وقیع سرمایہ وجود میں آگیا۔اُردو شعرا کے مسدس کے مقررہ قافیائی نظام میں جزوی تصرف کرنے

کے بعد اس میں ہر قسم کا مضمون بآسانی بیان کرنے کا جوہر پیدا ہو گیا ہے۔ مسدس کا ہر بند اپنے نظامِ قوافی کے لحاظ سے دو اجزا میں منقسم ہوتا ہے مگر ماہیتی لحاظ سے ہر بند ایک معنوی وحدت ہے، جس کے پہلے چار مصرعوں میں کوئی تفصیل دی جاسکتی ہے اور پھر بیتِ مصرّع میں اس کا ماحصل پیش کیا جاسکتا ہے۔ مسدس ترکیب بند میں اتنی لچک اور وسعت ہے کہ اس کے ایک ایک بند میں تاریخ کا ایک ایک واقعہ یا قابل بیان مضمون کا ایک ایک پہلو ترتیب وار بیان ہو سکتا ہے۔ اخلاقیات ہو یا سیرت؛ مذہب ہو یا سیاست؛ فلسفہ ہو یا تاریخ؛ کوئی بھی مضمون مسدس کا موضوع بن سکتا ہے۔ مفصل خیالات و جذبات کے مربوط اظہار کے لیے مثنوی کے بعد مسدس ایک متناسب ہیئت ہے۔ اسی مناسبت سے حالی کے بعد اقبال نے بھی اپنے فکری ابلاغ کے لیے متذکرہ شعری ہیئت کا مؤثر استعمال کیا ہے۔

حاصل کلام یہ ہے کہ اقبال نے حالی سے اپنی طبعی و نظری مطابقت اور ذوقِ سلیم کی بہ دولت معتدبہ اثرات قبول کیے ہیں۔ گو دونوں شعرا کا شعری اسلوب ان کے اپنے اپنے تصورِ فن کا نقیب ہے تاہم دونوں میں قومی احیا کے متعلق فکری ہم آہنگی موجود ہے۔ اسی نسبت سے حالی کی نظم عرضِ حال اور اقبال کی نظم شکوہ اور جوابِ شکوہ میں خاصی مماثلتیں ملتی ہیں۔ گو عرضِ حال قصیدے کی ہیئت میں ہے جب کہ شکوہ و جوابِ شکوہ مسدس کی ہیئت میں مرتب ہیں لیکن تینوں نظموں میں فکری اشتراک نمایاں ہے اور اسی بنیاد پر کہا جاسکتا ہے کہ اسلوب اور ہیئت کے فرق و امتیاز کے ساتھ 'شکوہ' اور 'جواب شکوہ'، 'عرضِ حال' کی معنوی توسیع ہیں۔

مشہور زمانے میں ہے نامِ حالی
معمور مئے حق سے ہے جامِ حالی
میں کشورِ شعر کا نبی ہوں گویا
نازل ہے مرے لب پہ کلامِ حالی
(اقبال)

☆☆☆☆☆

حوالے اور حواشی

(۱) الطاف حسین حالی، دوسرا دیباچہ متعلق بہ ضمیمہ ۳۰۳ھ،مسدسِ حالی، (لاہور:تاج کمپنی،۱۶۹)،۸۔

(۲) مسدس مدوجزر اسلام کی شہرت و مقبولیت کی تفصیل جاننے کے لیے اس کے دوسرے دیباچے، سید سلیمان ندوی کے مقدمہ مسدس حالی (صدی ایڈیشن، مرتبہ سید عابد حسین)،تذکرۂ حالی مصنفہ شیخ اسماعیل پانی پتی، یادگارِ حالی مصنفہ صالحہ عابد حسین اور مقالات کا مطالعہ کیا جاسکتا ہے۔

(۳) سکسینہ،رام بابو،تاریخِ ادبِ اردو، مترجمہ مرزا محمد عسکری، (نئی دہلی: بزمِ خضر راہ، ۲۰۰۰ء)،۳۶۳۔

(۴) غلام رسول مہر،مطالبِ بانگِ درا، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز،۱۹۹۱ء)،۲۰۷۔

(۵) اقبال، غزل نمبر ۲۵،زبورِ عجم، (لاہور: شیخ غلام علی اینڈ سنز پبلشرز، طبع دہم،۱۹۹۴ء)،۵۵۔

(۶) سید وقار عظیم،اقبال شاعر اور فلسفی، (علی گڑھ:ایجوکیشنل بک ہاؤس،۱۹۸۲ء)،۱۰۱ ، ۱۰۲۔

(۷) سید عابد علی عابد،نفائسِ اقبال، مرتبہ شیما مجید، (لاہور:اقبال اکادمی پاکستان،۱۹۹۰ء)،۵۹۔

(۸) مصنف مذکور، کتابِ مذکور،۹۳۔

(۹) شیخ عبدالقادر، نذرِ اقبال، مرتبہ حنیف شاہد، (لاہور: بزمِ اقبال،۱۹۷۲ء)،۱۴۹تا۱۶۰۔

(۱۰) بقا، محمد شریف،شرح شکوہ جوابِ شکوہ، (لاہور: علم و عرفان پبلشرز ۲۰۰۶ء)، ۲۹۔

(۱۱) مہر غلام رسول،مطالبِ بانگِ درا،۲۵۰۔

(۱۲) ان نظموں سے اس امر کا انکشاف ہوتا ہے کہ اقبال کا شعری وجدان جب مسدس ترکیب بند میں مصروفِ تخلیق ہوتا ہے تو اسی ہیئت میں برابر سرگرم سخن رہتا ہے تاآں کہ ان کے تخلیقی عمل میں موضوع اور اسلوب کا کوئی مطابقت پذیر تغیر نہ پیدا ہو جائے۔اقبال نے مفصل مضامین کی مرتب پیش کش کے لیے مسدس کو ایک متناسب شعری سانچے کے طور پر استعمال کیا ہے۔ ابوالاعجاز حفیظ صدیقی کی تحقیق کے مطابق علامہ اقبال کو شروع شروع میں مسدس ترکیب بند سے بہت دل چسپی تھی مگر یہ دل چسپی کم ہوتے ہوتے بالکل ختم ہوگئی۔انھوں نے مسدس میں کل بارہ نظمیں لکھی ہیں، جو بانگ درا کے حصۂ اول و سوم میں شامل ہیں، بانگ درا کے سوا کسی اور مجموعے میں علامہ اقبال نے کوئی نظم اس ہیئت میں نہیں لکھی۔(اوزانِ اقبال،۱۹۸۳ء ،ص۳۱)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ادب میں رجحانات، اسالیب، شعری سانچوں اور پیمانوں کے تبدیل اور ارتقاپذیر ہونے کے ساتھ ساتھ اقبال کے شعری سانچے اور اسالیب بھی ان کے موضوعات کے مطابق تبدیل ہوتے رہے ہیں۔

❖❖❖